ماجد ممتاز
پی ایچ ڈی سکالر، شعبہ اردو، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز، اسلام آباد

’’قید‘‘: توہم پرستی اور استحصال کا منظر نامہ

Majid Mumtaz
PhD Scholar, Urdu Department,
National University of Modern Languages, Islamabad

"Qaid": Superstition and Exploitation Scenario

"Qaid" is one of the important novels of Abdullah Hussain, although less discussed by his critics. In this short novel Abdullah Hussain has portrayed the scenario of superstition of the poor and illiterate people of society and their exploitation by religious and political masters. Especially the cruel, horrible and nauseous face of fake spiritual leaders is exposed. In the present article the researcher has critically discussed the novel in this context.

ادب کی دنیا بالخصوص ناول میں دو طرح کی تحریروں سے واسطہ پڑتا ہے۔ کچھ تحریروں میں کہانی اتنی مضبوط ہوتی ہے کہ کرداروں پر حاوی ہو کر ان کو اپنی اوٹ میں چھپا لیتی ہے جبکہ بعض صورتوں میں کردار اپنے اندر اتنی مضبوطی لیے ہوتے ہیں کہ قاری کو کہانی یاد رہے یا نہ رہے لیکن کردار اس کی ذات کا اَن مٹ حصہ بن کر رہ جاتے ہیں جنہیں بھلانا ان کے بس میں نہیں ہوتا۔ چند ایسے اہم ناول بھی وجود میں آئے ہیں جن کے بارے میں یہ فیصلہ کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہے کہ ان کا وجود اور ان کی بے مثال ادبی و سماجی اہمیت ان کے پلاٹ یعنی کہانی کی وجہ سے ہے یا کرداروں (characterization) کی وجہ سے۔ ایسے ہی ناولوں میں سے ایک عبداللہ حسین کا تحریر کردہ ناول ’’قید‘‘ بھی ہے۔

’’قید‘‘ عبداللہ حسین کا ایک مختصر ناول ہے جو ۱۹۸۹ء میں چھپ کر سامنے آیا۔ اس ناول کو وہ پذیرائی حاصل نہ ہوئی جو ’’اداس نسلیں‘‘ کو حاصل ہے اور نقادوں نے بھی اس پر کوئی خاص توجہ نہ دی حالانکہ یہ ناول مختصر ہونے کے باوجود اپنے اندر ایک جہانِ معنی رکھتا ہے۔ ناول میں معاشرے کے بہت سے حساس موضوعات کو زیر بحث لایا گیا ہے اور استحصالی قوتوں جن میں سیاست، پولیس، مولوی، اور خاص طور پر پیری فقیری نمایاں ہیں کو مختلف صورتوں میں پیش کیا گیا ہے۔ ہمارے معاشرے میں مولوی، پیر اور طاقت کے چند دیگر سرچشمے جس قدر توہمات، استحصال اور غلط عقائد کی ترویج میں حصہ دار ہیں ناول میں اس کو آڑے ہاتھوں لیا گیا ہے۔

معاشرہ انسانوں سے تخلیق پاتا ہے اور انسان ہی اس کی بنیادی اکائی ہیں۔ ان کے حقوق کا خیال رکھنا لازم ہے۔ بلاتفریق مرد و عورت ہر ایک کے حقوق کا تحفظ ہونا چاہیے۔ اگر معاشرے میں انسانی حقوق کی پامالی ہوتی رہے تو یہ انسانوں کا نہیں درندوں کا معاشرہ بن جائے گا۔ اسی پسِ منظر میں عبداللہ حسین نے اس ناول میں معاشرے کی بہت سی

قباحتوں کو بے نقاب کیا ہے۔ناول کی ابتداء مائی سروری سے ہوتی ہے جو دنیا جہاں سے بے خبر ہمیشہ چار پائی پر بیٹھی رہتی ہے۔نیند اور اونگھ اسے نہیں آتی ،خوراک بہت کم لیتی ہے،صرف زندہ رہنے کے لیے ایک دو دن کے بعد کھاتی ہے ۔خانقاہ والے اس کا بہت خیال رکھتے ہیں۔اس کے علاوہ ناول کے مرکزی کرداروں میں چوہدری برکت علی، چوہدری کرامت علی، فیروز شاہ اور رضیہ سلطانہ ہیں اور ان کے علاوہ ذیلی کرداروں میں احمد شاہ، مراد،علی محمد، چوہدری اکرام اور نسرین شامل ہیں۔

پورا ناول کرامت علی، فیروز شاہ اور رضیہ سلطانہ کے گرد گومتا ہے۔چوہدری برکت کا بیٹا چوہدری کرامت علی تعلیم مکمل کرنے کے بعد جیل میں ملازمت کرتا ہے۔وہاں اس کے ساتھ ایک واقعہ پیش آتا ہے جس کی وجہ سے وہ دنیاداری ترک کر کے خالصتاً مذہبی آدمی بن جاتا ہے۔پھر آہستہ آہستہ پیری فقیری شروع کر دیتا ہے اور ایک سلسلہ طریقت 'کرامتیہ' شروع کرتا ہے۔جس کے بعد وہ مذہب سے دور ہوتا جاتا ہے اور صرف مال و دولت جمع کرنے اور عورتوں سے لذت حاصل کرنے میں لگ جاتا ہے۔فیروز شاہ ایک امام مسجد کا بیٹا ہے جو کہ نہ صرف کالج کا بہترین طالب علم ہے بلکہ عملی سیاست میں بھی سرگرم رہتا ہے اور غریب اور لاچار عوام کی تقدیر بدلنے کے خواب دیکھتا ہے۔یوں وہ عملی سیاست کے افق کا ایک چمکتا ستارہ بن کر ابھرتا ہے جب کہ رضیہ سلطانہ غریب ماں باپ کی اولاد ہونے کے باوجود اعتماد اور ذہانت کی دولت سے مالا مال ہوتی ہے کہ یہ خزینے کسی کی میراث نہیں ہوتے۔کرامت علی، فیروز شاہ اور رضیہ سلطانہ زمانۂ طالب علمی سے ہی ایک دوسرے سے شناسا تھے۔فیروز شاہ اور رضیہ سلطانہ عملی سیاست میں ہمرکاب ہونے کے ناطے ایک دوسرے کے بہت قریب آ گئے اور غیر رسمی انداز میں میاں بیوی کی طرح رہنا شروع کر دیا۔فیروز شاہ سیاست کے میدان میں وہ بہت دور نکل جاتا ہے اور صوبائی اسمبلی کے الیکشن لڑنے کی تیاری کر رہا ہوتا ہے کہ ایک دن اپنے گھر کے چوبارے میں مردہ حالت میں پایا جاتا ہے۔اس کی موت اس کے گھر کے لیے ایک بڑا صدمہ ہوتی ہے۔اس کا باپ ذہنی توازن کھو دیتا ہے اور ماں فاقوں سے مر جاتی ہے۔رضیہ سلطانہ کے گھر بھی حادثات پیش آتے ہیں،اس کی والدہ انتقال کر جاتی ہے اور والد پر فالج کا حملہ ہوتا ہے اور وہ جسمانی توازن کھو دیتا ہے۔اسی دوران رضیہ سلطانہ گمنامی کی زندگی گزارنا شروع کر دیتی ہے اور ایک طویل عرصہ گزرنے کے بعد جیل کی کال کوٹھڑی میں موت کی منتظر دکھائی دیتی ہے جو کہ تین بندوں کو قتل کرنے کی وجہ سے اس کا مقدر بنتی ہے۔رضیہ اور فیروز شاہ کے تعلق سے رضیہ حاملہ ہو جاتی ہے اور ایک ناجائز بچے کی ماں بن جاتی ہے ۔اس بچے کی پیدائش فیروز شاہ کی وفات کے بعد ہوتی ہے۔رضیہ اس بچے کو احمد شاہ کی مسجد کی سیڑھیوں پر چھوڑ آتی ہے کہ دادا اپنے پوتے کی پرورش کر لے گا لیکن احمد شاہ بچے کو ناجائز جان کر اور کسی کے گناہوں کا بوجھ قرار دے کر مراد، علی محمد اور چوہدری اکرام کے ہاتھوں سنگسار کروا دیتا ہے۔اپنے بچے کے انتقام کے طور پر رضیہ ان تینوں کو قتل کر دیتی ہے۔اور یہ کہانی وہ احمد شاہ کو اپنی پھانسی سے ایک رات قبل سناتی ہے۔

یوں ''قید'' موضوع کے اعتبار سے منفرد نوعیت کا حامل نہیں ہے۔استحصال اپنی مختلف شکلوں میں اردو ناول کے اندر ایک مستقل موضوع کی حیثیت سے ہمیشہ موجود رہا ہے۔شوکت صدیقی کے ناول ''خدا کی بستی'' سے لے کر عبداللہ حسین کے ''قید'' تک کئی ناول استحصال کی مختلف صورتوں اور استحصالی قوتوں کا احاطہ کرتے ہیں۔لیکن اس ناول کے فکری کینوس میں بہت

وسعت پائی جاتی ہے۔ایک دیہات کو بنیاد بنا کر مصنف نے سماج میں مجموعی طور میں پھیلی ہوئی توہم پرستی، گھٹن، افلاس، غربت، سیاسی بانجھ پن، مذہبی، جسمانی اور نفسیاتی استحصال، مفاد پرستی اور ہوسِ زر کو اس ناول میں پیش کر کے کسی بھی حساس اور دردِ دل رکھنے والے قاری کے دل و دماغ میں ایک ارتعاش ضرور پیدا کیا ہے اور اسے یہ سوچنے پر بھی مجبور کیا ہے کہ کب تک۔۔۔آخر کب تک؟ محمد عاصم بٹ ''قید'' کے موضوع کے بارے میں لکھتے ہیں:

> عبداللہ حسین نے ہمارے سماجی اور اخلاقی نظام پر سخت تنقیدی پیرایہ اختیار کیا ہے۔ناول کی کہانی انسانی محرومیوں اور تشنہ کامیوں اور اقدار کی خواہش میں کی جانے والی بھیانک سرگرمیوں کے گرد بنی گئی ہے۔روشن خیالی اور قدامت پرستی کی باہمی پیکار کو کہانی کا موضوع بنایا گیا ہے۔ناول کے اختتام پر ہمیں بتایا جاتا ہے کہ طویل جنگ کے بعد آخر قدامت پرستی کی فتح ہوتی ہے۔روشن خیالی کو سارا سماج مل کر ختم کر دیتا ہے۔(۱)

ناول ''قید'' میں عبداللہ حسین نے ایک سے زیادہ موضوعات کو زیر بحث لایا ہے جن میں مذہب کے نام پر استحصال بنیادی موضوع ہے۔اس کے ساتھ ساتھ پاکستان میں پیری فقیری کے نظام کی بھی بڑی وضاحت سے عکاسی کی گئی ہے۔روحانیت کے پردہ میں پیری فقیری اور خانقاہی نظام ہمارے معاشرے کا ایک اہم پہلو ہونے کے ناطے اردو ادب کا ہمیشہ ایک اہم موضوع رہا ہے۔شاید ہی کوئی اہم ناول نگار ایسا ہو جس نے اس موضوع پر کسی نہ کسی حوالے سے اپنی تحریروں میں طبع آزمائی نہ کی ہو۔نذیر احمد کے ناول ''ابن الوقت'' سے لے کر قرۃ العین کے ''گردشِ رنگِ چمن'' تک ہر دور میں یہ موضوع اردو ناول کا ایک اہم حوالہ رہا ہے۔''قید'' میں عبداللہ حسین نے تفصیل کے ساتھ یہ بات زیرِ بحث لائی ہے کہ کس طرح توہم پرستی کی بنیاد پر جنم لینے اور جڑیں پکڑنے والا یہ سلسلہ غریب، بے آسرا، جاہل، کم تعلیم یافتہ اور ضعیف الاعتقاد عوام کے بدترین استحصال کا باعث بنتا ہے۔اس کے ساتھ ساتھ عوام کی ضعیف الاعتقادی پر بھی تفصیلی بات کی گئی ہے جو ہر کام کا جلد حصول چاہتے ہیں اور اس کوشش میں عاملوں اور پیروں کے ہتھے چڑ جاتے ہیں اور اس کے عوض اپنی دولت اور عزت دونوں سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔عبداللہ حسین نے استحصال و جرائم کی ان تمام صورتوں کو کمال مہارت سے بیان کیا ہے۔ایک مقام پر انہوں نے دکھایا ہے کہ کس طرح ضعیف الاعتقاد عورتیں اولاد کی غرض سے ان پیروں کے پاس آتی ہیں اور وہ ان کی عزت سے کھیلتے ہیں۔دیہاتوں میں مذہب، درگاہوں، خانقاہوں اور زیارتوں کے نام پر پھیلائی جانے والی جہالت، بے حیائی اور استحصال کو عبداللہ حسین نے ایک مقام پر یوں دکھایا ہے:

> شاہ جی اپنی گدی پہ تکئے سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ان کے آگے ایک ننگا بدن قالین پر لمبا چِت پڑا تھا۔اس بدن کے پاؤں دروازے کے رخ اور سر دوسری جانب تھا۔۔۔وہ الف ننگا بدن، جس کے تلوں پہ جوتا تک نہ تھا۔ایک عورت کا جسم تھا جس پہ سر سے لے کر پاؤں تک شاہ جی اپنا ایک ہاتھ نہایت آہستگی سے بار بار پھیرے جا رہے تھے۔عورت کی آنکھیں بند تھیں اور وہ بے حرکت وہاں لیٹی تھی، گویا بیہوش پڑی ہو۔۔۔ان کے آگے بچھے ہوئے بے لباس جسم اور اس

> کے اوپر چلتے ہوئے موٹی موٹی نیلی نسوں اور ابھری ہوئی ہڈیوں والے ہاتھ نے ایک انوکھی سی فضا پیدا کر رکھی تھی۔ (۲)

''قید'' میں دکھائے گے سلسلۂ خانقائی میں انسانیت کی تباہی و بربادی اور بدترین استحصال کے سوا کچھ بھی نہیں۔ دین کی ترویج واشاعت تو دور کی بات وہاں بات دین کے بدترین استحصال تک پہنچ چکی ہے۔ دینِ اسلام کی بنیاد نماز پر یہ کہتے ہوئے رکھی گئی 'الصلوٰۃ عماد الدین' لیکن چوھدری کرامت علی پیری فقیری کا دھندہ شروع کرنے کے بعد نماز سے دور ہوتا چلا گیا۔ اسلام پردہ پر بہت زور دیتا ہے: محرم اور غیر محرم کے اختلاط کی کسی صورت بھی اجازت نہیں دیتا لیکن چودھری کرامت لوگوں 'مریدین' خاص طور پر عورتوں کو اولاد کی بشارت دینے کے بہانے ان کے برہنہ جسموں سے لذت حاصل کرنے میں ہمہ وقت مشغول نظر آتا ہے۔ ناول میں پیری فقیری کے روپ میں عورتوں کی عزت کے ساتھ کھیل کھیلنے کا ذکر کئی بار آیا ہے۔ یہ بھولی بھالی عورتیں اپنی ضعیف الاعتقادی کی وجہ سے ان لوگوں کے جال میں پھنس جاتی ہیں۔ ان میں سے اکثر اس عقیدہ کے ساتھ پیر کرامت شاہ کے ڈیرے پر آتی ہیں کہ اس طرح ان کی اولاد کی مراد اور خواہش پوری ہو جاتی ہے۔ عبداللہ حسین نے ایک اور مقام پر یوں لکھا ہے:

> پیر کرامت علی شاہ کے سامنے ایک الف ننگا بدن لاش کی صورت زمین پر سیدھا پڑا تھا۔ پیر صاحب اکڑوں بیٹھے اس بدن پر سر سے لے کر پاؤں تک ہولے ہولے اپنا ہاتھ پھیرتے جا رہے تھے اور ساتھ ساتھ حلق اور ناک کے اندر سے وہی پرانی لمبی لے والی گنگناتی ہوئی آواز پیدا کیے جاتے تھے۔ ۔۔اس جسم کا کوئی انگ اپنی جگہ نے ہلا، صرف چہرے نے آنکھیں کھول دیں۔۔۔ لمبی پلکوں والی بڑی بڑی، سیاہ چمکدار اور روشن آنکھیں ٹک ٹک چھت کو تکے جا رہی تھیں۔ دفعتاً اس سارے جسم میں ایک شدید جھرجھری پیدا ہوئی۔ سر اوپر اٹھا، اور منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ پہلے اسے نے دونوں ہاتھوں سے اپنی چھاتیوں کو ڈھانپا، پھر گھٹنے اٹھا کر چھاتی سے لگائے اور ہاتھوں سے چہرہ چھپا کر گٹھڑی سی بن گئی۔۔۔ اب نسرین کپڑوں کو دونوں ہاتھوں میں لیے، اپنے گندمی بدن کے آگے دبائے پیروں کے پنجوں پہ گویا ہوا میں اٹکی کھڑی تھی۔ (۳)

یہ استحصالی مناظر تو عبداللہ حسین نے ایک ماہر پیر کے دکھائے ہیں۔ ان پیروں کی اولادیں، جو نئی نسل کے پیر بننے جا رہے ہیں جب وہ گدی نشین ہونے کو ہوتے ہیں تو ان کے دل میں جس طرح کے خیالات پیدا ہوتے ہیں اور وہ ان خیالات سے سرور حاصل کرتے ہیں۔ اس منظر کو عبداللہ حسین نے یوں بیان کیا ہے:

> اس سرور کی رو کے نیچے نیچے ایک اور لہر اچھال مار کے نکلی اور رواں ہو گئی۔ اس لہر کے اندر صنفِ نازک اور برہنہ بدنوں کا تلذّذ گھلا ملا تھا۔ ان کے احساس میں، اس تلذّذ کے اندر نسرین اور اس کی ہم ذات قوم کی جانب ایک پر لطف کدورت کا مادہ شامل تھا جو تلذّذ کے اثر کو دوبالا کر رہا تھا۔ صاحبزادہ سلامت علی کے لبوں پر ایک لطیف مسکراہٹ بکھر گئی۔ (۴)

ایک اور مقام پر پیر صاحب جب اپنی یہ غیر اخلاقی اور خلافِ شریعت حرکت کرتے ہوئے بیٹے کے ہاتھوں پکڑے جاتے ہیں تو درج ذیل الفاظ میں اپنی بے گناہی ثابت کرتے ہوئے دکھائے گئے ہیں:

> اب میں صرف ان کے بدن پر ہاتھ پھیرتا ہوں اور کچھ نہیں کرتا۔ انہیں پاک صاف چھوڑ دیتا ہوں۔ نسرین کو بے اُمید نہیں لوٹا سکتا تھا۔ کسی غلط خیال کو دل پر مت لگاؤ۔ میں خدا کی قسم کھاتا ہوں۔(۵)

عبداللہ حسین نے یہاں نہایت خوبصورتی کے ساتھ پیر صاحب کی اصلیت سے پردہ اٹھایا ہے۔ اللہ کی ذات پر ان کا یقین محض اس حد تک ہے کہ اپنی ذات کے بھید کھل جانے پر اس ربِ کائنات کے نام کی قسم کھائی مگر جو مکروہات وہ جاری و ساری رکھے ہوئے ہیں، مذہب کے نام پر جو استحصال کیے جارہے ہیں اس پر انھیں کوئی شرمندگی، کوئی پچھاوا، کوئی احساس ندامت نہیں ہے۔ عبداللہ حسین نے جس طرح ان نام نہاد روحانی سلسلوں کی تشکیل کے عمل کا احاطہ کیا ہے اور بھرپور طنزیہ انداز میں اس سارے عمل سے وابستہ حقائق سے پردہ کشائی کی ہے وہ ان کے سماجی و معاشرتی شعور کا آئینہ دار ہے۔

کردار نگاری اور حقیقی منظر کشی کے ضمن میں انھوں نے جزئیات نگاری کا فن بہت خوب صورتی کے ساتھ برتا ہے۔ حوادثِ زمانہ کے نتیجے میں کس طرح پیر اور نیم فقیر قسم کے لوگ جنم لے کر 'نیم حکیم خطرۂ جاں' کے مصداق سادہ لوح، ضعیف الاعتقاد لوگوں کے دین، ایمان اور اعتقادات سے کھیلتے ہیں، ان کے دینی عقائد کو دین ہی کی آڑ میں ملیا میٹ کرتے ہیں اس کی تصویر کشی کرتے ہوئے مصنف لکھتے ہیں کہ ایک بے اولاد شخص چوھدری برکت علی کے ہاں ایک فقیر کی دعا سے بچہ پیدا ہوا۔ وہ بچہ بھرپور عہدِ شباب گزارتا ہے، ایک حسینہ، رضیہ سلطانہ، کی زلفوں کا اسیر رہتا ہے لیکن اس کی نگاہِ التفات نہ پا کر محض سپرنٹینڈنٹ جیل کی نوکری تک محدود ہو جاتا ہے اور بعد میں وہ بھی چھوڑ دیتا ہے اور گاؤں کی مسجد میں امام بن جاتا ہے۔ کچھ عرصہ بعد، نیکی، پرہیز گاری یا عبادت گزاری کے سبب نہیں بلکہ اتفاقاً دم درود شروع کر دیتا ہے اور رفتہ رفتہ چوہدری کرامت علی، کرامت علی شاہ، پیر کرامت علی شاہ جبکہ اس کا ڈیرہ پیر کرامت علی شاہ، حجرۂ پیر کرامت علی شاہ براقی عرف بابا چدّر پوش بائی گدّی شریف کچّا کھوہ، سلسلہء کرامتیہ سے ہوتا ہوا بلآخر دربار شریف حضرت پیر کرامت علی شاہ براقی المعروف بابا چدّر والے، گدّی سلسلہ کرامتیہ تک پہنچ جاتا ہے۔ یوں کرامت علی نے، بغیر کسی مذہبی تعلیم و تربیت یا ان اوصافِ حمیدہ کے جو کسی بھی ولی اللہ کی شان ہوتے ہیں اور ایک عام بندے کو اس اعلیٰ مرتبہ پر پہنچاتے ہیں، خود کو خود ہی اس مقام پر فائز کر دیا اور سماجی و عوامی قبولیت حاصل کرنے کی خاطر معاشرے کی کئی بااثر شخصیات جن میں ریٹائرڈ جنرل اور بیوروکریٹس وغیرہ شامل ہیں کو اپنے معتمدینِ خاص میں شامل کر لیا۔

اِس ناول میں پیروں کے علاوہ جس دوسرے بڑے استحصالی ٹولے کی نشاندہی کی گئی ہے وہ مولوی ہیں جو دین کے ٹھیکیدار بنے بیٹھے ہیں۔ ان کو اس بات تک کا علم بھی نہیں کہ انسان کی جان ان کے مذہب میں سب سے زیادہ قیمتی قرار دی گئی ہے اور اس کے احترام و تقدس کی قسم ان کے رب نے اٹھائی ہے۔ ناول میں رضیہ سلطانہ فیروز شاہ کی وفات کے بعد اس کے ناجائز بیٹے کو جنم دے کر مولوی احمد شاہ کی مسجد کی سیڑھیوں پر رکھ دیا کہ دادا خود پوتے کی پرورش کرلے گا لیکن مولوی نے نومولود کو

سیڑھیوں پر دیکھ کر گندی گندی گالیاں دیں اور آنے والے نمازیوں سے اس بچے کا قتل صرف اس لیے کروا دیا کہ وہ بچہ کسی کی ناجائز اولاد ہے اور اس نے مسجد کی حرمت میں خلل ڈالا ہے۔ حالانکہ اللہ کا حکم ہے کہ ہر بچہ خدا کی فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔ وہ تو کافر یا مسلمان بھی نہیں ہوتا تو پھر وہ مسجد کو کس طرح حرام یعنی ناپاک کر سکتا تھا۔ یہاں مولوی صاحب نمازیوں کو اشتعال دلا کر اس بچے کو سنگسار کروا دیتے ہیں جو کہ کسی کے گناہوں کا بوجھ ہونے کے باوجود خود گناہ گار نہیں تھا، پاک تھا، صاف تھا، اپنے رب کی فطرت کا مظہر تھا۔ یوں مولوی صاحب مذہبی تعلیمات کو مذہب (مسجد کی حرمت) ہی کے نام پر پامال کر کے مذہب کے بدترین استحصال کا باعث بنے۔ ذیل میں رضیہ سلطانہ اس واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتی ہے: ''اس بچے کو یاد کرو میاں جی جس کو آپ کی مسجد کی سیڑھیوں پر پتھر مار مار کر ہلاک کر دیا گیا تھا۔'' (۶)۔ اس بچہ کی طرف اشارہ کر کے مولوی صاحب نے جو کچھ کہا تھا اس بارے میں وہ کہتی ہے:

> پھر میں نے دیکھا کہ آپ نے واہی تباہی بکنا اور انگلی اٹھا اٹھا کر میرے بچے کی جانب اشارہ کرنا شروع کر دیا۔ جو الفاظ میرے کانوں تک پہنچ رہے تھے ان میں حرامی اور ناجائز اولاد اور مسجد اور بے حرمتی کے لفظ بار بار آتے تھے۔۔۔ جب مراد نے پتھر اٹھا کر اسے مارا، پھر علی محمد نے اور چوہدری اکرم نے تو میں نے پہلی بار اس کی ننھی چیخ کی آواز سنی۔۔۔ بتا احمد شاہ، بتا، تو اس بہیمانہ جرم کا مرتکب کیوں ہوا؟ (۷)

مسجد کی حرمت کے متعلق امام مسجد صاحب کے خیالات، ان کا مجموعی رویہ، ان کے غلط فتویٰ دینے جیسے مسائل علی نواز شاہ کے ناول ''گروماں'' میں بھی زیرِ بحث لائے گئے ہیں۔ یہ دونوں ناول اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ جو بنیادی علم کسی بھی امام مسجد کے لیے ضروری ہونا چاہیے ہمارے امام اس کے عشرِ عشیر سے بھی واقف نہیں اور اپنی کم علمی کی وجہ سے معاشرہ میں بدامنی اور عدم برداشت کے رویہ کو پروان چڑھانے کا باعث بنتے ہیں۔

ایک جانب جہاں دین کے نام نہاد رکھوالے لوگوں کے دینی وجذباتی استحصال کی ایک بڑی وجہ کے طور پر سامنے لائے گئے ہیں وہاں عبداللہ حسین نے نیرنگیِ سیاستِ دوراں سے بھی پردہ اٹھاتے ہوئے استحصالی نظام کے اس شریکِ کار کی کارستانیوں کو فیروز شاہ کے کردار کے توسط سے منظرِ عام پر لایا ہے۔ وہ نوجوان نسل کا نمائندہ سیاست دان ہے جو انتہائی قابل ہونے کے علاوہ ملک وقوم کے لیے درد بھی رکھتا ہے اور کچھ کر گزرنے کا جذبہ بھی، ہمت بھی ہے اور حوصلہ و قابلیت بھی لیکن یہ سب کچھ ہونے کے باوجود اس نے اس قوم کو جو دیا وہ محض اس کی بیٹی کا جسمانی، جذباتی اور نفسیاتی استحصال تھا۔ رضیہ سلطانہ کے ساتھ محبت کی پینگیں بڑھانے کے بعد اس کو اپنے دامِ الفت میں الجھا کے بن بیاہی ماں کے رتبے پر بھی فائز کر دیا لیکن درحقیقت وہ اس کی زندگی میں کل نہیں محض ایک چھوٹے سے جزو کی مانند تھی، ایک سکون آور دوا یا پھر جذبات کو ٹھنڈا کرنے کا ایک ذریعہ۔ ڈاکٹر ممتاز احمد خان اس بارے میں لکھتے ہیں: ''عبداللہ حسین کے ہیروز عورت کا حق ادا نہیں کرتے۔ وہ عورت سے جنسی آسودگی کے تو متمنی ہیں لیکن محسوس ہوتا ہے گویا وہ عورت کو اپنی زندگی کے لیے اتنا اہم نہیں گردانتے''۔ (۸) اس کے اسی رویے کے باعث رضیہ سلطانہ نے اس کے ساتھ شادی کے بندھن میں نہ بندھنے کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ کہتی ہے:

کیوں کرتی ۔۔۔ساری دنیا کا درد دل میں لیے پھرتا تھا۔جب میرے پاس آتا،دومنٹ میں
لڑھک جاتا اورمنہ پرے کر کے خراٹے لینے لگتا تھا جیسے میں کوئی حیوان ہوں یا پتھر کی سل ہوں
جس پر رگڑ کر چٹنی بنائی ،کھائی اور پرے کھڑی کردی ۔میں آدم زاد ہوں ۔حیوان نہیں
ہوں ۔(۹)

استحصال کا یہ سلسلہ عبداللہ حسین کی نظر میں رکنے کے بجائے دن بدن استحکام کی جانب گامزن ہےاور استحصال کے یہ مہرے اپنی سیاہ کاریوں کو چھپانے اور legitimize کرنے کی غرض سے اپنے سیاسی وسماجی روابط کو جس طرح استعمال کرتے ہیں اس کو واضح کرنے کے لیے انہوں نے ناول میں ایک بڑے استحصالی طبقے کے فوج اور بیوروکریسی کے ساتھ روابط کو نمایاں طور پر بیان کیا ہے۔استحصالی نظام کی مضبوطی اور دوام کی خاطر جس طرح ایک ریٹائرڈ بریگیڈیئر کی زیرسرپرستی ایک باقاعدہ اور منظم عسکری ونگ تشکیل دیا گیا ہے وہ ہمارے معاشرے کے لیے ایک ناسور ہی نہیں بلکہ لمحہ فکریہ بھی ہے۔صاحبزادہ سلامت شاہ اور بریگیڈیئر کے درمیان کچھ یوں گفتگو ہوتی ہے:

آپ نے کمیونسٹوں کی تاریخ کا مطالعہ کیا ہے؟۔۔۔ان کا فلسفہ تو دہریہ خیالات کی بنیاد پر ہے مگر ان
کی پارٹی کی تنظیم لاجواب ہے۔۔۔صاحبزادہ سلامت علی شاہ نے ارادہ کرلیا تھا کہ ضروری کاموں
سے فارغ ہو کر جلد از جلد ایسی تنظیم کا احیاء ہوگا اور اسے بریگیڈیئر (ریٹائرڈ) ارشاد احمد خان کی
سربرائی میں دے دیا جائے گا۔(۱۰)

ناول کے کردار مائی سروری کو بہت سے ناقدین قدامت پسندی کی علامت کے طور پر لیتے ہیں اور ناول کے اختتام پر اس کی تندرستی کو قدامت پسندی کی نشاۃِ ثانیہ سے تعبیر کرتے ہیں۔دوران مطالعہ یہ بات سامنے آتی ہے کہ مائی سروری ایک بھرپور عہدِ شباب کے بعد اس نحیف حالت کو پہنچی تھی جہاں اس کی تمام تر توانائی ختم ہو چکی ہے اور وہ موسم و حالات سے یکسر لاعلم ہے،موت کے بہت قریب یا نیم مردہ۔لیکن خانقاہ،استحصالی طبقے کی علامت، کے اندر اس کو لگا تار خوراک بہم پہنچائی جاتی رہی،اس کو نہلایا دھلایا جاتا رہا اور اس کے بناؤ سنگار کو قائم و دائم رکھنے کی کوششیں ہمہ وقت جاری و ساری رہیں۔دوسری طرف رضیہ سلطانہ،فیروز شاہ اور کرامت جو نئی تہذیب اور روشن خیالی کے تعلیم یافتہ نمائندہ کردار تھے اپنے ارادوں اور مقاصد کے ساتھ وابستگی کو نہ نباہ سکے اور وقت،حالات اور قسمت کے ہاتھوں ناکام و نامراد ٹھہرے ۔یوں یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ مائی سروری محض قدامت پسندی ہی کی علامت نہیں بلکہ اس کے تانے بانے تو ہم پرستی اور استحصالی نظام سے بھی ملتے ہیں۔دو نمبر جعلی پیروں فقیروں کے ٹھکانے ہوں یا استحصالی بیوروکریسی اور فوج کے نمائندے، یہ سب مل کر اس کو زندہ رکھنے کی تگ و دو میں کوشاں نظر آتے ہیں اس لیے کہ ان کے مروجہ استحصالی نظام کی سلامتی اس کی بقاء میں ہی مضمر ہے۔یوں ہار یا موت نئی تہذیب اور روشن خیالی کا مقدر ٹھہرتی ہے اور قدامت پسندی،توہم پرستی اور استحصالی نظام نئی زندگی پانے میں کامیاب رہتا ہے۔

مجموعی طور پر عبداللہ حسین کے اس ناول میں سبھی کردار اپنے معاشرے کی اخلاقی ،مذہبی اور مسخ ہوتی تہذیب کی نمائندگی کر رہے ہیں۔اس ناول سے یہ عیاں ہوتا ہے کہ سماج کے ٹھیکیدار جب خود گندے اور ناکارہ عناصر کی شکل اختیار

کر لیتے ہیں، ذلت کی اتھاہ گہرائیوں میں گر جاتے ہیں تو زندگی بے حساب تلخ، کسیلی، پیچیدہ، بدبودار اور بدنما شکل اختیار کر لیتی ہے۔

حواشی

۱۔ محمد عاصم بٹ، عبداللہ حسین: شخصیت وفن، اکادمی ادبیات پاکستان، ۲۰۰۸ء، ص ۸۹

۲۔ عبداللہ حسین، قید، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۸ء، ص ۲۱، ۲۲

۳۔ ایضاً، ص ۷۰

۴۔ ایضاً، ص ۱۱۵

۵۔ ایضاً، ص ۱۰۴

۶۔ ایضاً، ص ۹۴

۷۔ ایضاً، ص ۹۵، ۹۶

۸۔ ممتاز احمد خان، ڈاکٹر، اردو ناول کے بدلتے تناظر، اردو اکیڈمی پاکستان، ۲۰۰۷ء، ص ۲۱۰

۹۔ عبداللہ حسین، قید، ص ۱۰۰

۱۰۔ ایضاً، ص ۱۱۴